بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انتخابات کسی سنجیدہ، باشعور اور تعمیری مقاصد رکھنے والی قوم کے لیے ایک اہم اجتماعی فریضہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے انعقاد کی غرض یہ ہوتی ہے کہ عوام کو یہ حق دیا جائے کہ وہ آزادی سے اپنی مرضی کے مطابق اپنے لیے ایسے حکمران چن لیں جو نہ صرف اُن کے جان و مال، عزت و آبرو کی بخوبی حفاظت کر سکیں بلکہ اُن کی اجتماعی اُمنگوں کو بطریق احسن پروان چڑھا سکیں جنھیں وہ پیکرِ محسوس میں ڈھالنے کے شدید آرزومند ہوتے ہیں۔

ووٹ کے ذریعہ حکومت کرنے والے ہاتھوں کی تبدیلی انسانیت کا ایک بیش قیمت تجربہ ہے جس نے انسانیت کو اُس کرب و بلا سے بچایا ہے جس میں قومیں ناپسندیدہ فرمانرواؤں کی تبدیلی کے وقت برابر مبتلا ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انتخابات بالکل منصفانہ ہوں تاکہ حکمرانوں کے معاملے میں عوام کو اپنی مرضی بروئے کار لانے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ انتخابات کا یہ عمل جس قدر آزادانہ ہوگا اُسی نسبت سے قوم کی سیاسی تربیت ہوگی اور اُس میں نیک و بد کی تمیز اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی

اس کے برعکس اگر انتخابات کے اعلانات تو بڑے کرّوفر سے کیے جائیں اور ملک کا حکمران طبقہ انہیں اپنی جمہوریت نوازی کے ثبوت میں بطور روشن دلیل پیش کرے مگر اس کے لیے وہ آزاد فضا مہیا نہ ہونے دے جس میں لوگ جبر و اکراہ کے بغیر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں تو انتخابات کی ساری

کاروائیاں محض ڈھونگ بن کر رہ جاتی ہیں جس سے ملک اور قوم کو شدید نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ انتخاب اگر کسی قوم کے لیے سنجیدہ معاملہ نہ رہے بلکہ محض ڈھونگ کی حیثیت اختیار کرلے تو اس سے عالمی برادری میں اس قوم کی ساکھ گر جاتی ہے۔ چنانچہ جن آمرانہ حکومتوں کے تحت انتخابات کا ناٹک رچا کر ایک خاص گروہ کو مسندِ اقتدار پر چپکا دیا جاتا ہے وہاں نہ تو جمہوری اداروں کو استحکام نصیب ہوتا ہے اور نہ بیرونِ ملک کوئی شخص ان کی جمہوریت پسندی پر یقین کرکے ان کا احترام کرتا ہے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ برسرِاقتدار طبقہ حکومت تو دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے لیکن لوگوں کو فریب دینے کی غرض سے انتخابات کا تماشہ دکھا رہا ہے۔ پھر اس طبقہ کے بارے میں لوگوں کو اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ یہ عوام میں اپنی مقبولیت اور وقار کھو چکا ہے اس لیے اسے یہ خوف لاحق ہے کہ اگر عوام کو اظہار رائے کی آزادی دی گئی تو وہ لازمی طور پر اس کے خلاف ہی فیصلہ دیں گے۔ اس وجہ سے وہ ووٹ کے صحیح استعمال میں مزاحم ہوتا ہے۔ انتخابات کے معاملے میں کسی گروہ کی دھاندلی اس کے احساسِ شکست کی علامت ہوتی ہے۔ اس سے ملک میں حکمران طبقے کے خلاف شدید نفرت پھیل جاتی ہے۔ واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ جن حکمرانوں نے ناجائز ہتھکنڈوں کی مدد سے انتخابات جیتنے کی کوشش کی یا اپنی بداعمالیوں کے پیشِ نظر اس قومی احتساب سے خوفزدہ ہوکر اسے ٹالنے پر زور دیا انہیں جلد ہی عوامی غیظ و غضب کا نشانہ بن کر مسندِ اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے متحدہ ہندوستان میں جس طرح کے انتخابات منعقد ہوتے رہے اور انگریز نوکرشاہی کے ذریعے اپنی پسند کے جاگیرداروں کو مسندِ اقتدار پر براجمان کرنے کے لیے جو چالیں چلتا رہا اُن سے پوری دنیا واقف ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ غیرملکی سامراج اپنے ناجائز مفادات کے تحفظ کے لیے اس طرح کی غیر اخلاقی کارروائیاں کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن ہم اسے پاکستان کا سب سے بڑا المیہ سمجھتے ہیں کہ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد بھی یہاں کے عوام کو اس بات کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ حکومت کے ایوانوں میں اپنی پسند کے نمائندے بھیج سکیں۔

مرحوم لیاقت علی خان جن پر منصفانہ انتخابات منعقد کرانے کی سب سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، اُن سے اس باب میں کوتاہی سرزد ہوئی - اگر وہ ایک دو مرتبہ پوری خوداعتمادی اور عزم سے کام لیتے ہوئے اس میدان میں نہایت اچھی روایات قائم کر دیتے تو پھر جمہوریت کو صحیح خطوط پر نشوونما پانے کے لیے زبردست سہارا ملتا - مگر افسوس وہ بعض مخصوص مصلحتوں کے تحت یہ کام سرانجام نہ دے سکے جس سے ملک میں جمہوریت کی مٹی پلید ہونا شروع ہوئی -

نوابزادہ لیاقت علی کے بعد یہاں جو شخص بھی مسندِ اقتدار پر فائز ہوا، اُس نے سازشوں کی مدد سے یہ مرتبہ حاصل کیا - ملک غلام محمد سیاسی گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بنا - اس نے جمہوری اصولوں کو اپنے پاؤں تلے روند کر عوام کی گردنوں پر مسلط رہنے کی کوشش کی اور مختلف حیلوں، بہانوں سے بلکہ چیرہ دستیوں سے کام لے کر ان انتخابات کو التوا میں ڈالا اور کسی اخلاقی، قانونی اور آئینی جواز کے بغیر محض اقتدار کے نشہ میں بدمست ہو کر دستور ساز اسمبلی کو توڑ ڈالا - اس بے بصیرت شخص نے صرف اپنی طاقت کے زعم میں اس سنگین اقدام کے نتائج سوچے بغیر یہ سب کچھ اس غلط مفروضہ کی بنا پر کر ڈالا کہ اس سے اُس کا دورِ اقتدار طویل ہو گا اور یہ انتہائی غیر دانشمندانہ قدم اُٹھاتے ہوئے اُس نے ان خرابیوں پر غور کرنا گوارا نہ کیا جنہیں اس قسم کے جنونانہ اقدام بالعموم جنم دیتے ہیں - اس شخص کے برسرِاقتدار آنے سے پیشتر بھی ملک کی سیاسی فضا آمرانہ رجحانات سے کسی حد تک مکدّر تھی، لیکن اس کے جمہوریت کُش عمل کی وجہ سے اس فضا پر تیرگی کے مہیب بادل چھا گئے جن کی آستینوں سے پیہم ایسی بجلیاں گرتی رہیں جنہوں نے عوام کے تصورِ آزادی اور اُن کے انسانی حقوق کو بالکل غارت کر کے رکھ دیا -

اس بگڑے ہوئے مزاج کے آمر نے ملک کے ڈیفنس سیکرٹری اور فوج کے سربراہ اور پولیس کے اعلیٰ افسران اور دوسری نوکر شاہی کی مدد سے جو چاہا ہر قسم کے احتساب سے بے نیاز ہو کر کیا جس سے ملک بڑی سرعت کے ساتھ تباہی و بربادی کی طرف بڑھنے لگا، لیکن اس نے اپنی غلط بخشیوں کی مدد سے خوشامدیوں اور ضمیر فروشوں کا ایسا مضبوط ٹولہ تیار کر لیا جو اُس کے ہر قول و فعل پر، خواہ وہ دینی اور قومی نقطۂ نظر سے کتنا ہی ناپسندیدہ ہوتا، تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسانے پر تیار رہتا - یہی وہ ٹولہ تھا جس نے دستور ساز اسمبلی توڑنے جیسے گھناؤنے جرم پر اُسے نجابت دہندہ

کہہ کر اُس کی مدح و ستائش کی۔ چنانچہ ملک صاحب کی اس عاقبت نا اندیشانہ روش نے ملک میں غلط روایات قائم کیں کہ سب سے پہلے جائز و ناجائز ہتھکنڈوں کے ذریعے عنانِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی جائے اور پھر اقتدار کی قوت سے ملک میں ایسی فضا قائم کی جائے جس میں مخالفت کی ہر آواز دب کر رہ جائے۔ اور اگر کوئی آواز اُٹھے تو صرف مدح و ستائش کی آواز ہو۔

جس طرح بُرائی بدی کے بطن سے جنم لیتی ہے اور بدی ہی کو معرض وجود میں لاتی ہے اسی طرح آمریت سیاسی گھٹن کی کوکھ سے نمودار ہوتی ہے اور سیاسی استبداد کا سلسلہ دراز کرتی ہے۔ چنانچہ ملک صاحب جیسے آمر کا تسلط ختم کرنے کے لیے ایک ایسا شخص آگے بڑھا جسے اپنے عہدہ کی بنا پر فوج میں اچھا خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا اور اپنی اس مضبوط پوزیشن کی وجہ سے محلاتی سازشوں میں نہایت مؤثر کردار ادا کر رہا تھا۔ اس نے ہمت اور جرأت کر کے اس مفلوج شخص سے اقتدار تو چھین لیا مگر اُسے اُن عوام کی طرف لوٹانے کے بجائے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اُس کا امین ٹھیرایا تھا خود اس پر بلا شرکتِ غیرے قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔ اور عام آبادی کو اس کے انسانی اور جمہوری حقوق سے اسی طرح محروم رکھنے کی کوشش کی جس طرح اس کے پیشرو کے عہد حکومت میں رکھا گیا تھا۔ چنانچہ عوام بیچارے کالانعام ہی رہے اور انھیں انسان سمجھ کر ان سے کوئی عزت و احترام کا معاملہ نہ کیا گیا۔ آمر چونکہ سازش کی پیداوار ہوتا ہے اس لیے عوامی تائید کی نہ تو وہ کوئی ضرورت محسوس کرتا ہے اور نہ اُسے اس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اسے ہمیشہ اس بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ نوکر شاہی کے اندر قوت و طاقت کے سارے مراکز پر صرف اسی کا قبضہ رہے تاکہ وہ اُن کی مدد سے مخالفین کو ٹھکانے لگا سکے۔ چنانچہ وقت کا یہ آمر سرکاری مشینری کے چند اونچے عہدہ داروں کے ہاتھوں میں کھیلتا ہے اور اسی طرزِ عمل کو اپنے حق میں مفید خیال کرتا ہے اور نوکر شاہی کے مضبوط حصار کی پناہ لے کر عوام پر تابڑ توڑ حملے کر کے ان کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھیرنے اور ان کی قوت توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ سکندر مرزا نے پاکستانی فوج کے سربراہ فیلڈ مارشل محمد ایوب اور حکومت کی مشینری کے چند دوسرے کل پرزوں کی مدد سے ہر وہ کام کیا جس سے ملک پر اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہو اور مخالفت کا کوئی خفیف سے خفیف جھونکا بھی اس کی مسندِ اقتدار

کو چھوتے نہ پائے لیکن افسوس ان ساری حفاظتی تدابیر کے باوجود اُسے اُن لوگوں کی سازشوں کی وجہ سے بہت بے آبرو ہو کر تختِ اقتدار سے الگ ہونا پڑا جنہیں وہ اپنی دانست میں اپنے لیے مضبوط پناہ گاہ سمجھ رہا تھا۔ جس شخص کی قوت کے بل بوتے پر سکندر مرزا ایک آمرِ مطلق بنا بیٹھا تھا، اُس کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ جب وہ کسی دوسرے فرد کو تخت نشین کرانے کی قوت رکھتا ہے تو وہ اُسے وہاں سے ہٹا کر خود اس پر براجمان کیوں نہیں ہو سکتا۔ اسی زعم میں گرفتار ہو کر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے دستور کو کالعدم قرار دے کر پورے ملک میں مارشل لا نافذ کیا اور اس طرح ملک کو بے آئین کر دیا اور پھر محض فوج کی قوت سے عوام پر مسلط ہو کر من مانی کارروائیاں کرنے لگا۔ اقتدار کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس نے اُس کی سوچ کو اس قدر مفلوج کر دیا تھا کہ اُسے قطعاً یہ بات سجھائی نہ دی کہ وہ جو اقدام کر رہا ہے وہ اُس حلف کی خلاف ورزی ہے جسے اُٹھا کر وہ ایک دستور کے تحت ملک کی مسلح افواج کا سربراہ بنا ہے، اس لیے اُس کا یہ فعل صریح بغاوت کا مترادف ہے۔ اُس فوجی سربراہ نے مارشل لا نافذ کر کے عوام میں زبردست خوف و ہراس پھیلا دیا۔ ان حوصلہ شکن حالات میں بھی چند باضمیر انسانوں نے نہ صرف اس کی اس غیر قانونی جسارت پر شدید احتجاج کیا، بلکہ اس صریح ناانصافی پر ملک کی سب سے اُونچی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر صد افسوس جج صاحب نے وقتی مصالح کی آڑ میں ایسا فیصلہ صادر کر دیا جس سے اس باغیانہ کارروائی کو سندِ جواز حاصل ہو گئی۔

فوجی حکمران اور عوام میں دس برس تک کشمکش جاری رہی۔ فوجی ڈکٹیٹر اس انداز سے نظامِ مملکت چلانے پر زور دیتے رہے گویا قوت کا منبع اور طاقت کا سرچشمہ ان کی ذاتِ گرامی ہے، اور وہ جو کہہ دیں وہی ملک کا آئین ہے اور جو وہ کر دیں وہی دستوری روایات ہیں۔ دوسری طرف عوام اُن کی ان آمرانہ کارروائیوں کو اپنے حقوق کی پامالی سمجھ کر انہیں مختلف طریقوں سے روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کشمکش نے جو مارشل لا کے نفاذ کے روزِ اوّل ہی سے شروع ہو چکی تھی، آہستہ آہستہ زور پکڑا اور حکمران صاحب عوامی دباؤ کے تحت ملک کو آئین دینے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن چونکہ وہ دستور عوامی آرزوؤں کا ترجمان نہ تھا بلکہ ایک آمر کے غیر محدود اختیارات کو تحفظ

دینے والا تھا، اس لیے عوام اُس سے کسی طرح بھی مطمئن نہ ہو سکے، اور حکمراں کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات میں مسلسل شدّت پیدا ہوتی رہی، جس نے فیلڈ مارشل کو یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ رائے عامہ کے علی الرغم محض انتظامیہ کی قوت کے بل بوتے پر لوگوں کی گردنوں پر زیادہ دیر تک مسلط رہنا کسی طرح بھی ممکن نہیں، اور جبر و تشدّد کا یہ عمل قوم، ملک اور خود اُن کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس حقیقت کے ادراک کے بعد وہ عوام کو ان کے چھینے ہوئے حقوق واپس کرنے پر آمادہ ہی تھے کہ ایک دو عاقبت نا اندیش سیاسی طالع آزماؤں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بحالیٔ جمہوریت کی یہ کشتی ساحلِ مراد پر پہنچنے کے بجائے مارشل لاء کی ایک دوسری خوفناک لہر کی نذر ہو کر رہ گئی، اور قوم نے دس سال کی جدّوجہد کے بعد اپنے آپ کو بے بسی اور محرومی کے اُسی مقام پر پایا جہاں وہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں محمد ایوب خان کے مارشل لا کے وقت حیران و ششدر کھڑی تھی۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مارشل لا کے ذریعہ عنانِ اقتدار فوج کے سربراہ محمد یحییٰ خان کو منتقل کر دی۔ اس شخص نے حالات کے خشمگین تیور دیکھتے ہوئے ملک میں انتخابات منعقد کرانے کا التزام تو کیا لیکن اُن اُمنڈتے ہوئے طوفانوں کی طرف قطعاً توجہ نہ دی جو اُن انتخابات کی افادیت کو برباد کرنے والے تھے۔ مارشل لاء کی تیرہ فضا میں صوبہ پرستی کی تحریک نے کافی زور پکڑا اور اس وجہ سے مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ ملک کے سربراہ نے اس خطرناک صورتِ حال پر غور کیے بغیر وَن یونٹ کو توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفرت کے دبے ہوئے جذبات لاوا بن کر پھوٹ پڑے جس نے ملک کی ساری فضا کو مسموم بنا دیا۔ ہیجان کی اِس خوفناک کیفیت میں عوام نے انتخابات میں تعمیری انداز پر سوچ کر کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے جذباتی نعروں میں بہ کر بعض غلط فیصلے کر دیے، جس کا بعد میں انہیں شدید احساس بھی ہوا۔ یحییٰ صاحب نے بظاہر تو ہر سیاسی جماعت کے لیے یہ بات لازمی قرار دی کہ وہ اپنا منشور اُن کے پیش کردہ دستوری ڈھانچے کے مطابق تیار کرے، لیکن اُس کی پابندی کرانے میں وہ بالکل بے بس رہے، اور بعض سیاسی جماعتوں نے اس سے صریحاً انحراف کرتے ہوئے ایسے

منشور پیش کیے جو پاکستان کے بنیادی تخیل سے منافرت رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم محدود اور وقتی مصلحتوں کے زیرِ اثر آکر انتشار کا شکار ہو گئی۔

اِس سارے عرصہ میں مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور سابق مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کا طرزِ عمل ہر لحاظ سے ناپسندیدہ رہا۔ اور اِن دونوں حضرات نے کوئی تعمیری کام سرانجام دینے کے بجائے عوام کے جذبات سے کھیل کر ہر قیمت پر مسندِ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس معاملہ میں نہ تو اُنہوں نے عوامی خواہشات کا کوئی احترام کیا اور نہ کسی صاحبِ اختیار کی بات کو درخورِ اعتنا سمجھا اور بعض معاملات میں ایسا تعجب انگیز رویّہ اختیار کیا جس کی آج تک کوئی معقول توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً اقوامِ متحدہ کے اہم اجلاس میں بھٹو صاحب کا شریک ہونے سے معنی خیز گریز اور ایک فیصلہ کُن مرحلے پر جب مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں مصالحت کی صورت پیدا ہو رہی تھی ——— پولینڈ کی قرارداد کو چاک کر کے اجلاس سے بطورِ احتجاج واک آؤٹ کرنا جبکہ اُس قرارداد کو قبول کرنے کے واضح احکام مل چکے تھے۔ پھر ۱۹۷۰ء کے انتخابات نے پانچ سال کے لیے مسندِ اقتدار کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا اُسے "جمہوریت ہماری سیاست ہے" کا نعرہ بلند کرنے والے اس سیاستدان نے نہ صرف پائے استحقار سے ٹھکرا دیا، بلکہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے عوامی نمائندوں کو دھمکیوں کے ذریعے قومی اسمبلی کے اجلاس میں، جو ڈھاکہ میں منعقد ہو رہا تھا، شریک ہونے سے روک دیا۔ اِس کے ساتھ "اُدھر تم اِدھر ہم" کا شوشہ چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کو یہ بات سمجھائی کہ اُن کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار آنے کی واحد صورت یہی ہے کہ ملک دولخت ہو اور جس خطّے میں اُن کی اکثریت ہے اُس میں وہ مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائیں اور مشرقی پاکستان میں رہنے والوں کو اُن کی قسمت پر چھوڑ دیا جائے۔

کیا یہ واقعات کسی انتہائی خود پسند، متکبّر اور آمرانہ مزاج رکھنے والی شخصیت کا پتہ نہیں دیتے ؟

تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد بھی اِس حکمران کے آمرانہ طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کسی قوم کی سیاسی زندگی کا اِس سے بڑا حزنیہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جمہوریت (باقی بر صفحہ ۴۵)